بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

یہ حقیقت اگرچہ اپنی جگہ بڑی تلخ اور اندوہناک ہے مگر اس سے کسی صورت بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ پاکستان میں دستور سازی کی تاریخ ایک مسلسل اور عظیم المیہ ہے۔ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو جب یہ ملک معرضِ وجود میں آیا تو اس وقت ۱۹۳۵ء کے انڈیا ایکٹ کو ہی عبوری دستور کے طور پر اپنایا گیا اور مجلس دستور کو یہ فرض سونپا گیا کہ وہ اہلِ پاکستان کے قومی تقاضوں کے مطابق دستور کی تدوین کرے مگر پاکستان کے چھپے ہوئے دشمنوں نے اس خطۂ پاک کی نظریاتی بنیاد کے بارے ہی میں عوام کے اندر مختلف قسم کے شکوک و شبہات پیدا کرنے شروع کر دیئے لیکن ان فتنہ پردازوں کو اپنے مذموم مقصد میں کوئی خاطر خواہ کامیابی نصیب نہ ہوئی اور ۱۹۴۹ء کی قراردادِ مقاصد کے ذریعے، جسے پاکستان کی عدالتِ عظمیٰ نے اپنے ایک حالیہ فیصلے میں پاکستان کی اساس تسلیم کیا ہے، یہ بات ہمیشہ کے لیے طے ہو گئی کہ اس ملک کا دستور اسلامی ضابطۂ حیات کا ہر لحاظ سے ترجمان ہو گا۔ اس قراردادِ مقاصد کے بعد بھی اسلام دشمن طاقتیں اس ملک کو اسلام کی راہ سے ہٹانے میں اپنا پورا زور صرف کرتی رہیں۔ مگر ان کی کوششوں کے علی الرغم دستور سازی کا کام کسی نہ کسی طور آگے بڑھتا رہا تا آنکہ ۱۹۵۴ء میں ایک ایسا دستور تیار ہو گیا جس میں اگر چند مناسب تبدیلیاں کر دی جاتیں تو یہ دستور اہلِ پاکستان کی قومی ضروریات اور تقاضوں کو کافی حد تک پورا کر سکتا تھا۔ اس فیصلہ کُن مرحلے پر ایک سرپھرے اور آمرانہ مزاج رکھنے والے گورنر جنرل کو خدا جانے کیا سوجھی کہ اس نے دستور ساز اسمبلی کو ہی توڑ دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تدوینِ دستور کے معاملے میں جو کام ہو چکا تھا وہ بالکل غارت ہو کر رہ گیا اور یہ ملک زمین بے آئین ہونے کی وجہ سے بڑی سُرعت کے ساتھ آمریت کے مہیب غاروں کی طرف لڑھکنے لگا۔ پھر ۱۹۵۶ء میں ایک نئی دستور ساز اسمبلی بلائی گئی جس نے ملک میں آئینی خلا کے خطرات کو اچھی طرح بھانپتے ہوئے بڑی مستعدی کے ساتھ ایک ایسا آئین تیار کر لیا جو ۱۹۵۴ء کے مسودۂ دستور سے کافی بہتر تھا اور جسے پوری قوم بعض ترامیم کے ساتھ قبول کرنے پر بالکل آمادہ تھی اور یہ توقع پیدا ہو گئی تھی کہ عنقریب ملک میں اس دستور کا نفاذ ہو گا اور اس کے فوراً بعد اس کی بنیاد پر نئے انتخابات منعقد ہوں گے اور اس طرح اہلِ پاکستان کے قافلے نے قراردادِ مقاصد کی صورت میں اپنے لیے جو سمت

متعین کی ہے اس کی طرف وہ دستور کی تیار کردہ راہ پر بڑی تیزی کے ساتھ گامزن ہو سکے گا۔ مگر افسوس کہ توقعات کے بے خیالی خاکے حقیقت کا رنگ بھرنے سے پہلے ہی سکندر مرزا اور ایوب خان کے آمرانہ عزائم کی وجہ سے خواب پریشان ہو کر رہ گئے اور ملک مارشل لا کے تسلط میں آ گیا۔ سکندر مرزا نے ملک کا اقتدار فوج کے حوالے کرتے ہوئے بڑے واشگاف الفاظ میں اس بات کا اعلان کیا تھا کہ جلد ہی ملک کے ذہین اور محب الوطن افراد کو جمع کر کے ان کے سپرد یہ کام کیا جائیگا کہ وہ ایک ایسا دستور تیار کریں کہ جو مسلم قوم کے مزاج سے پوری طرح ہم آہنگ ہو اور جب یہ دستور تیار ہو جائیگا تو پھر اسے قوم کے سامنے رائے کے لیے پیش کیا جائے گا۔ اور آخر کار استصواب رائے کے بعد اس کا ملک میں نفاذ ہوگا لیکن ہماری بدقسمتی کہ ان میں سے کوئی ایک وعدہ بھی پورا نہ کیا گیا۔

پہلے چار سال تک تو فیلڈ مارشل صاحب مارشل لا کے بل بوتے پر ملک میں من مانی کارروائیاں کرتے رہے اور ۱۹۶۲ء میں ملک کو جو دستور عطا کیا اس کا مقصد بجز اس کے اور کوئی نہ تھا کہ صدر صاحب کی آمریت کو کسی طرح دستور کی سند جواز حاصل ہو جائے اور وہ اپنی آمرانہ اور مطلق العنان سرگرمیوں کو مارشل لا کے نام پر جاری رکھنے کے بجائے دستور اور جمہوریت کے نام پر جاری رکھ سکیں۔ یہ دستور در حقیقت پاکستانی قوم کے لیے کوئی دستور نہ تھا بلکہ فیلڈ مارشل ایوب صاحب کے خسروانہ اختیارات کا محض ایک پروانہ تھا جو خود انہوں نے قوم کے نام جاری فرمایا جن بزرجمہروں نے اس دستور کی تدوین کی انہوں نے اس بات کا خاص طور پر اہتمام کیا کہ اس ملک میں قوت و اختیار کا مرکز و محور صرف صدر صاحب کی ذات ہو۔ اور ساری قوم ان کی مرضی کی اس طرح تابع ہو جس طرح کہ بھیڑوں کا گلہ گلہ بان کی لاٹھی کا تابع ہوتا ہے۔

ظاہر بات ہے کہ صدر صاحب کے ان لامحدود اختیارات کے اس شاہی فرمان کو اس ملک کا قانون بنانے کے لیے اس بات کی ضرورت نہ تھی کہ استصواب رائے کے ذریعے اس کے بارے میں عوام کے ردِعمل کو معلوم کر لیا جاتا۔ چنانچہ یہی ہوا کہ فرمانِ شاہی کی طرح اسے قصرِ صدارت سے جاری کر دیا گیا۔ اور اس ضمن میں کسی فرد یا گروہ کی رائے معلوم کرنے کی زحمت بھی گوارا نہ کی گئی بلکہ اس کے ساتھ قوم کے نام یہ فرمان بھی جاری ہوا کہ اگر زبان کھولو تو اس کی تعریف و توصیف میں کھولو، ورنہ خاموش رہو۔ اس دستور میں صدر ایوب صاحب نے اپنے لیے ایسے وسیع اختیارات حاصل کر لیے تھے کہ اگر ان کی بجائے کوئی دوسرا صدر ہوتا اور پھر ان سے یہ پوچھا جاتا کہ کیا وہ کسی دوسرے صدر کو بھی اس قدر لامحدود اختیارات دینے کے لیے تیار ہیں تو وہ کبھی بھی ایسی دھاندلی کو قبول کرنے کے لیے

آمادہ نہ ہوتے مگر اپنے لیے انہوں نے ان اختیارات کو بالکل جائز سمجھا۔ چنانچہ اس دستور کا وہی حشر ہوا جو عام طور پر خود پسند اور حریص فرمانرواؤں کی احمقانہ کوششوں کا ہوتا ہے کہ یہ دستور بھی اکبر کے دین الٰہی کی طرح ایوب صاحب کے تختِ اقتدار سے ہٹتے ہی دفن ہو گیا۔

اسے اس ملک کی بدقسمتی کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے موجودہ فرمانرواؤں نے اپنے پیشروؤں کے انجام سے قطعاً کوئی سبق حاصل نہیں کیا بلکہ وہ اسی غلطی کے ارتکاب پر مُصر ہیں جو پہلے حکمران کر چکے ہیں اور جس کی وجہ سے یہ ملک ابھی تک سرزمینِ بے آئین ہونے کی بنا پر طوائف الملوکی کا شکار ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ آمرانہ مزاج رکھنے والے ان اصحابِ اقتدار کو لامحدود اختیارات کے چٹورپن نے حقائق سے اس حد تک غافل کر دیا ہے کہ وہ اتنی سادہ سی بات بھی سمجھنے سے قاصر ہیں کہ جس دستور میں حاکم و محکوم کے مابین اختیارات کی تقسیم عدل و انصاف کی بنیاد پر نہ ہو گی آخر اس ظالمانہ دستور کو عوام کس طرح خوش دلی کے ساتھ قبول کر سکیں گے۔ جو لوگ علم سیاست کا معمولی علم بھی رکھتے ہیں وہ اس حقیقت کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ ایک اچھے دستور کو جن خوبیوں کا حامل ہونا ضروری ہے ان میں ایک نمایاں خوبی یہ ہے کہ دستور اس نوعیت کا ہو کہ ملک کی عظیم اکثریت اسے خوشدلی کے ساتھ قبول کرے اور اس کی پابندی اس پر شاق نہ گزرتی ہو۔ ظاہر بات ہے کہ یہ وہی دستور ہو سکتا ہے جو معاشرے کے مختلف طبقوں کے درمیان عدل و انصاف کا ضامن ہو۔ اور کسی قوم کے مزاج اور اس کی اجتماعی امنگوں سے اس حد تک مطابقت رکھتا ہو کہ عوام اِس دستور کی ایک ایک شق کو اپنی آرزوؤں کا مظہر اور اپنے دل کی پکار خیال کرتے ہوں۔ مگر ہمارے اس ملک کے دستور سازوں نے تدوینِ دستور کے معاملے میں ان بنیادی حقائق کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے ایک ایسا دستوری مسودہ تیار کیا ہے جو نہ تو قومی عزائم کا آئینہ دار ہے اور نہ تقسیم اختیارات کے معاملے میں انصاف اور توازن کا ضامن، البتہ اس میں ایک شخصیت کا پرتو ہر زاویۂ نگاہ سے اور ہر مقام پر اُبھر کر سامنے آتا ہے۔ اور یوں دکھائی دیتا ہے کہ یہ دستور کسی قوم کو تعمیر و ترقی کی راہ پر گامزن کرنے کے لیے تیار نہیں کیا گیا بلکہ صدر بھٹو صاحب کے لامحدود اختیارات کو دستوری تحفظ دینے کے لیے مرتب کیا گیا ہے۔ یہ دستور بھی ۱۹۶۲ء کے دستور کی طرح کسی لحاظ سے بھی ہماری قوم کا دستور کہلانے کا مستحق نہیں بلکہ صدر بھٹو صاحب کی شخصیت کے گرد ایک حالہ ہے جس کا مقصد محض اُن کی ذات کو نمایاں کرنا اور اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک لوگوں کو یہ تاثر دینا ہے کہ اس ملک کے سیاسی اُفق

پرصرف ان کی ذاتِ گرامی ہی جھلملا رہی ہے باقی یہاں تاریکی ہی تاریکی ہے۔ موجودہ حالات میں دستور سازی صدر بھٹو صاحب کی ذات کی کسی حد تک تابع ہے اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ جب صدر بننے پر مصر تھے تو سارے اختیارات صدر کے ہاتھ میں سمیٹ دینے کا التزام کیا گیا تھا اور اب جبکہ انہوں نے پارلیمانی نظام کے تحت وزیراعظم بننا گوارا کیا ہے تو اختیارات کی ساری باگیں وزیراعظم کے ہاتھ میں دے دی گئی ہیں۔ مسودۂ دستور کے مطابق صدر کا منصب محض ایک آرائشی منصب بن کر رہ گیا ہے۔ ذوالفقار علی صاحب کو بحیثیت وزیر اعظم وہ سارے اختیارات حاصل ہیں جن کا مطالبہ صدارتی نظام میں وہ بحیثیت صدر کر رہے تھے، بجز اس ایک بات کے کہ وزیر اعظم کے عہدے پر فائز ہونے سے وہ ۲۱ توپوں کی سلامی سے محروم ہو جائیں گے۔ باقی جہاں تک اختیارات کی وسعت کا تعلق ہے وہ ایوب خان صاحب کے اختیارات سے بھی کہیں زیادہ ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر وزیر اعظم کے اس منصب پر کسی دوسرے شخص کے فائز ہونے کے امکانات ہوں اور انہیں صدارت کے موجودہ اختیارات کے ساتھ منصبِ صدارت سنبھالنے کے لیے کہا جاتے تو وہ کبھی اس پر آمادہ نہ ہونگے کیونکہ انہوں نے وزارتِ عظمیٰ کے عہدے کو جن اختیارات سے مزین کیا ہے وہ درحقیقت وزارتِ عظمیٰ کے اختیارات نہیں بلکہ اپنی ذات کے اختیارات ہیں۔

کسی قوم کے ساتھ اس سے زیادہ شرمناک مذاق اور کیا ہو سکتا ہے کہ اُسے جمہوریت کا فریب دے کر دستور کے ایسے دام میں پھنسایا جائے جس کا ہر حلقہ اپنے اندر آمریت کی پوری شدت اور سختی رکھتا ہو اور جس کے تحت عوام اپنے آپ کو اس قسم کی جکڑبندیوں میں بے بس محسوس کرنے لگیں جس طرح کی جکڑبندیوں کا کسی فسطائی اور آمرانہ نظام میں تصور کیا جاسکتا ہے۔ محض انتخابات کا ڈھونگ رچا دینے سے تو کسی نظام کو جمہوری نہیں کہا جاسکتا کیونکہ ان انتخابات کا ڈھونگ تو فاشسٹ ممالک میں بھی وقتاً فوقتاً رچایا جاتا ہے مگر یہ محض ڈھونگ ہی ہوتا ہے۔

آپ مسودۂ دستور پہ اگر اچٹتی ہوئی نگاہ بھی ڈالیں تو آپ پر یہ حقیقت پوری طرح منکشف ہو جائے گی کہ اس دستور کی ترتیب و تدوین میں جو کاوش ہوئی ہے اس کا واحد مقصد یہی رہا ہے کہ کسی طرح بھٹو صاحب کو وزیر اعظم کے منصب پر فائز ہوتے ہوئے ایسے وسیع اختیارات حاصل ہو جائیں جو ہٹلر، مسولینی اور لینن اور سٹالن تک

کو حاصل نہ تھے اور جن کے حصول کی آرزو میں ہمارے ملک کے کئی سربراہ بہت آزما رہے اور اس کی تکمیل کے لیے انہوں نے ملک کی سلامتی تک کو داؤ پر لگا دینے سے تامل نہ کیا۔

عوامی حقوق کے معاملے میں یہ کس قدر ناانصافی بلکہ عوامی حقوق کی یہ کس قدر پامالی ہے کہ اسمبلی میں بالکل سادہ اکثریت سے منتخب ہونے والا وزیراعظم جب ایک مرتبہ وزارتِ عظمیٰ کی کرسی پر براجمان ہو جاتے تو پھر اسمبلی کے وہی ارکان اُسے معزول نہ کر سکیں جب تک کہ وہ دو تہائی یعنی ۱۰۰ میں سے ۶۶ ارکان اس کے عزل پر متفق نہ ہوں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وزیراعظم منتخب ہو جانے کے بعد ۶۶ کے مقابلے میں ۳۴ ارکان کی تائید سے وزارتِ عظمیٰ کے عہدے پر فائز رہنے کا اختیار رکھتا ہے۔ اُسے اس صریح غیر منصفانہ حق کے علاوہ یہ حق بھی حاصل ہے کہ اگر دو تہائی ارکانِ اسمبلی بھی اُسے اس منصب سے ہٹانے پر متفق ہو جائیں تو وہ اس عدمِ اعتماد کا اس وقت تک اسمبلی میں اظہار نہیں کر سکتے جب تک کہ وزارتِ عظمیٰ کے عہدے کے لیے کوئی متبادل نام پیش نہ کریں۔

یہ مشکل اور صبر آزما مرحلہ بھی صرف وزیراعظم کی رضامندی سے ہی طے ہو سکتا ہے کیونکہ اسے دستور کی رُو سے یہ اختیار بھی حاصل ہے کہ وہ جب چاہے اسمبلی کو توڑ کر تنہا حکومت کرتا رہے تاآنکہ نئے سرے سے عام انتخابات ہوں اور نئی اسمبلی معرضِ وجود میں آئے۔ وزیراعظم کے اس اختیار کے مقابلے میں اراکینِ اسمبلی کو یہ اختیار حاصل نہیں کہ وہ اسمبلی کو توڑ کر نئے سرے سے انتخابات کرا سکیں۔

پھر صدر وزیراعظم کے سامنے کس قدر کمزور اور بے بس ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب وزیراعظم صدر کو اسمبلی توڑنے کا مشورہ دے یا دوسرے الفاظ میں حکم دے تو صدر پر دو روز کے اندر اس حکم کی تعمیل لازم ہے۔ اور اگر وہ اس معاملے میں تاخیر کرے تو وزیراعظم خود ہی اسمبلی کو توڑ دینے کا مجاز ہے۔ وزیراعظم کے اس قسم کے اختیارات کی مثال دنیا کے کسی جمہوری ملک میں نہیں ملتی۔

اس مسودۂ دستور میں نہ صرف صدر کو وزیراعظم کا تابع بنایا گیا ہے بلکہ اسے عدلیہ پر بھی غیر معمولی برتری اور فوقیت دینے کا التزام کیا گیا ہے۔ ۱۹۵۶ء کے آئین کے مطابق پاکستان کی عدالتِ عظمیٰ کو نہ صرف عدالتِ عالیہ کے فیصلوں پر نظرثانی کا اختیار حاصل تھا، بلکہ ماسوائے فوجی عدالتوں کے اُن فیصلوں کے جو وہ پاکستان کی مسلح افواج کے ارکان کے بارے میں صادر کرتی تھیں باقی ہر سطح اور ہر نوعیت کی عدالتوں کے فیصلوں کے خلاف

عدالتِ عظمیٰ کی طرف رجوع کیا جاسکتا تھا۔ دوسرے لفظوں میں یُوں کہا جاسکتا ہے کہ اُس دستور کے مطابق پاکستان کے ہر شہری کو اس بات کا حق حاصل تھا کہ وہ ظلم و نا انصافی کی صورت میں عدالتِ عظمیٰ کا دروازہ کھٹکھٹائے اور اس عدالت کو اس امر کا اختیار تھا کہ اس کے مظلوم ہونے کی صورت میں اس کی داد رسی کرے۔ ۱۹۶۲ء کے آئین میں عدالتِ عظمیٰ کے ان وسیع اختیارات میں کسی حد تک کمی کر دی گئی مگر اُس دستور میں بھی عدالت کے اس منصب کو بہر حال تسلیم کیا گیا کہ وہ دستور کی نگہبان اور عوام کے بنیادی حقوق کی محافظ ہوگی اور جب بھی کسی شخص کا بنیادی حق سلب ہو رہا ہو تو وہ اس کی طرف رجوع کرنے کا مجاز ہو۔ مگر اس نئے مسودۂ دستور میں عبوری آئین کی دفعہ ۲۱۶ کو شامل کر کے عدالت کے دائرۂ اختیار پر ضرب کاری لگائی گئی ہے۔ دستور میں بظاہر عوام کو بنیادی حقوق سے نوازا گیا ہے مگر عدالت کے ذریعے ان کے تحفظ کا کوئی انتظام نہیں کیا گیا۔ نئے دستور کی رُو سے جس وقت مرکزی اسمبلی خاص ایکٹ کے ذریعے چند انتظامی عدالتیں قائم کر دیگی اس وقت مندرجۂ ذیل نوعیت کی نا انصافیاں صرف ان عدالتوں کے سامنے ہی پیش کی جاسکیں گی اور ملک کی دوسری اعلیٰ عدالتیں ان نا انصافیوں کے تدارک کے معاملے میں عضوِ معطل کی حیثیت اختیار کر لیں گی۔

——جب ملازمت میں کسی شخص کے ساتھ نا انصافی ہوئی ہو۔

——جب حکومت نے کسی شہری پر نا جائز ظلم کیا ہو یا کسی فرد یا گروہ پر جرمانے یا تاوان کا نا جائز بوجھ ڈالا ہے۔

——جب کسی شخص کی جائداد ضبط کی گئی ہو یا اسے فروخت کرنے پر مجبور کیا جا رہا ہو۔

معمولی سمجھ بوجھ رکھنے والا آدمی بھی اس حقیقت کو جانتا ہے کہ حکومت کی طرف سے شہریوں پر جو مظالم ڈھائے جاتے ہیں وہ ان تینوں نوعیتوں کے مظالم ہی ہوتے ہیں۔ اب اگر ملک کا عام شہری ملک کی ان اونچی عدالتوں کی طرف رجوع کرنے کا مجاز نہ ہوگا تو آخر اُن انتظامی عدالتوں سے کیا انصاف حاصل ہو سکے گا۔ جو خاص ایکٹ کے ذریعے اور مخصوص مقاصد کے پیشِ نظر قائم کی جائینگی۔ اس ضمن میں یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ اس قسم کی عدالتوں کے قیام کے لیے وہ اسمبلی قانون پاس کرے گی جس کا اپنا وجود وزیرِ اعظم کی رضامندی کا رہینِ منت ہوگا۔ کیا ایسی بے جان مقننہ سے اِس بات کی کوئی توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ ایسی عدالتوں کے قیام میں کامیاب ہو جو عوام کے بنیادی حقوق کے تحفظ کی خاطر برسرِ اقتدار طبقے کے مقابلے میں سینہ سپر ہونے کا حوصلہ اور عزم رکھتی ہوں۔

سرکاری ملازمین کا طبقہ کسی ملک کے وجود کے لیے وہی حیثیت رکھتا ہے جو انسانی جسم میں ریڑھ کی ہڈی کی ہوتی ہے۔ اگر یہ طبقہ جاندار اور دیانتدار ہو تو یہ ملک کو بسا اوقات بڑے ہولناک طوفانوں سے بچا کر ساحلِ مراد پہ لے جاتا ہے۔ دورِ حاضر میں فرانس اور جاپان میں اس طبقے نے جو تعمیری کردار ادا کیا ہے اس پر پوری دنیا گواہ ہے۔ ان ممالک میں مختلف سیاسی گروہوں کے مابین اقتدار کی رسہ کشی نے ایک ایسے خوفناک خلفشار کی صورت اختیار کر لی تھی جس سے ان ممالک کا وجود ہی خطرے میں پڑ گیا تھا مگر وہاں کی دانشمند، مستعد اور محب الوطن انتظامیہ نے اپنے بے مثال تدبر اور عزمِ راسخ سے نہ صرف جاپانی اور فرانسیسی قوم کو برباد ہونے سے بچایا بلکہ اس خلفشار کو دور کر کے ملک کے اندر اعتدال اور امن و امان کی ایک فضا قائم کی جس میں وہاں کے عوام تعمیر و ترقی کی راہ پر گامزن ہوتے۔ جب کسی ملک میں لگاتار سیاسی طوفان اٹھنے لگیں اور اجتماعی زندگی کی ناؤ ان کے اندر گھر کر ہچکولے کھانے لگے تو باہمت انتظامیہ لنگر کا کام دیتی ہے اور اسے طوفان کی نذر ہونے سے بچاتی ہے۔

اس حقیقت کو سمجھنے کے لیے کسی غیر معمولی ذہانت اور فطانت کی ضرورت نہیں کہ انتظامیہ یہ فرض اسی صورت میں بطریقِ احسن سرانجام دے سکتی ہے جب اسے اپنی ملازمت کا تحفظ حاصل ہو اور اگر وہ اس احساسِ تحفظ سے محروم ہو جائے، پھر نہ تو وہ معاشرے کے لیے ریڑھ کی ہڈی کا کام دے سکتی ہے اور نہ سیاسی خلفشار کے اندر قوم کی کشتی کے لیے لنگر ثابت ہو سکتی ہے بلکہ اس کی حیثیت موم کی ناک اور خس و خاشاک (سی) ہوتی ہے جسے معمولی سا دباؤ جس رخ چاہتا ہے بڑی آسانی کے ساتھ موڑ کر رکھ دیتا ہے اور سیاسی طوفان کی معمولی لہریں بھی جس طرف چاہتی ہیں اسے بہا کر لے جاتی ہیں۔ اس بنا پر ملکی استحکام کے لیے یہ ضروری تھا کہ دستور میں انتظامیہ کے لیے واضح تحفظات کا التزام کیا جاتا تاکہ وہ اطمینان اور سکون کے ساتھ ملک کی انتظامی مشنری کو سیاسی تغیرات کے علی الرغم چلانے میں مصروف رہتی۔ لیکن ہمارے ہاں انتظامیہ کے اندر احساسِ تحفظ پیدا کرنے کے بجائے اس کے دل و دماغ پر خوف و ہراس کی مستقل کیفیت طاری کرنے کا انتظام کیا گیا ہے۔ صدر بھٹو نے صدارت کے تخت پر براجمان ہوتے ہی سب سے پہلا یہ کام کیا کہ چودہ سو افسروں کو بیک بینی دوگوش نکال باہر کیا۔ اور یہ آمرانہ کارروائی اس انداز سے کی گئی جس کی نظیر کسی مہذب ملک میں نہیں ملتی۔ نہ تو ان ملازموں کو ان کے جرم سے آگاہ کیا گیا جس کی پاداش میں انہیں ملازمت سے محروم کیا جا رہا تھا اور نہ انہیں اپنے حق میں صفائی کا کوئی موقع فراہم کیا گیا۔ محض ایک نادر شاہی فرمان کے ذریعے وہ ملازمتوں سے

(باقی صفحہ ۲۶۳ پر)